AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www.al-aasar.com

Vol. 2, No. 3 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN:3006-6921

اردو شاعری کا علامتی نظام

THE SYMBOLIC SYSTEM OF URDU POETRY

Dr. Sadaf Fatima
Assistant Professor Department of Urdu University of Karachi
Dr Sajid Nadeem
E.S.T Punjab School Education Department
Saddique
Lecturer Department of Urdu University of Swabi

Abstract
Symbolic language is one of the major characteristics of Gazal throughout its history. Urdu Gazal has used different types of symbols extracted from its contemporary social and cultural environment .Same can be seen in modern period of Urdu literature. This article attempts to identify, distinguish and critically analyze the symbols used in modern era of Urdu Gazal.

Urdu ghazal, whether ancient or modern, has had symbolism, allegory, and symbolism as its basic features. Poets have used poetic devices such as allusions, metaphors, similes, metaphors, and symbols to create this layering. Thus, most of the words used in high literary expression have symbolic status, but the words used in ghazal poetry are especially characterized by symbolic properties. Dr. Hamid Kashmiri considers symbolism to be a characteristic of poetry rather than its decoration. According to him: "It is certain that the symbolism of poetry can increase the complexity and multifacetedness of the experience, but it is more correct to say that the poetic experience takes on symbolic form as a result of the application of diverse and contradictory elements at the poet's internal level. As if symbolism is a characteristic of poetry and not its decoration or the style it has developed.

Key Words: *Urdu poetry, Symbolic language, Urdu Gazal, Dr. Hamid Kashmiri, Multifacetedness, characteristic of poetry.*

ہمارے ہاں ادب کو عموماً براہِ راست بات کرنے کی بجائے بالواسطہ اظہار کو اہمیت دی جاتی ہے۔ خصوصاً علامتی اظہار کے بیانیے زیادہ برتے جاتے ہیں جس میں ظاہر اور سطحی اظہار کے بیانیے کے ذریعے سے اپنا مدعا و مقصد بیان کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ علامتی اظہار سے جہاں کسی حقیقیت کا سیدھا سادھا بیان ہوتا ہے وہاں دوسرے حقائق و وقائع کی بازآوری بھی کی جاتی ہے۔ انھی خصوصیات کی وجہ سے علامت نگاری کے پیرائے زیادہ وقیع اور بارآور ثابت ہوتے ہیں۔

جب ہم اردو کی ابتدائی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں ہمیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس حوالے سے ہمارے شعرا کے ہاں مفاہیم کی ترجمانی کے لیے علامت کی کمی کا مسئلہ درپیش تھا۔ علم محدود ہونے کی وجہ سے علامات کی تلاش میں مشکل پیش آ رہی تھی۔

فارسی شاعری علامات کے استعمال سے اردو شاعری کے لیے مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ اس سرزمین کے لیے اتنے مانوس نہ تھے بلکہ بعض اوقات ان کے استعمال سے ایک قسم کی شتر گربگی کا مسئلہ درمیان میں آجاتا تھا۔ اردو شاعری کے ابتدائی مراکز میں حیدر آباد دکن کو مرکزی حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے ہندوستانی علامات کے خدوخال نمایاں ہونے لگے تھے۔ فارسی علامات کے ساتھ ساتھ مقامی علامات بھی اُردو شاعری میں در آنے لگی تھیں۔

فارسی میں سعدی کو علامتی نظام کا نقطۂ آغاز کہا جا سکتا ہے۔ جب صفوی خاندان نے ایران میں زور پکڑا تو اس عہد میں ہندوستان میں فارسی اثرات در آنا شروع ہو گئے تھے۔ اُس وقت ہندوستان مغلیہ خاندان کے زیرِ تسلط تھا۔ ان اثرات نے مغلیہ دور میں فارسی پر گہرے اثرات مرتب کیے اور ہندوستان

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www.al-aasar.com
Vol. 2, No. 3 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN:3006-6921

فارسی شعر و ادب کا مرکز بن کر ابھرا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے زبان و ادب میں فارسی اثرات کے تحت "سبک ہندی" کی تحریک شروع ہو گئی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ "ہندی" یا "سہذوی" کی علامات اور استعارے نئے رنگ میں رنگ گئے۔ فارسی میں عرفیؔ، صائبؔ، نظیریؔ اور بیدلؔ نے اپنے مخصوص شعری تجربوں کے ذریعے علامات کی نئی نئی تعبیرات مرتب کیں۔ اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اردو شاعری کے پس پشت عرفیؔ اور بیدلؔ وغیرہ کی بنا کردہ فارسی کی ہی مستحکم شعری روایت موجود تھی اور اردو شعرا نے اپنی شعری روایت کی آزادانہ تشکیل کے جائے اسی فارسی میں روایت کو اختیار کیا۔ اردو شاعری نے بہت ہئیتی سانچے بھی اسی روایت سے مستعار لیے اور اس روایت کے شعری علامات کو بے تکلف اپنے تصرف میں لانا شروع کیا۔ چنانچہ اردو شاعری کو آزادانہ نشوونما اور اپنی راہ آپ بنانے کا موقع نہ مل سکا۔"(۱)

یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں جو بھی فارسی علامات در آئی ہیں ان میں گل، بلبل، شمع، پروانہ، برق، شمس، قمر، تارہ، نشیمن، بہار و خزاں، سبزہ و سرو، صیاد و قفس، جام، صراحی، اہل جنون، ساقی، مے خانے اور چمن وغیرہ شامل ہیں۔ بعد میں جیسا کہ کہا گیا ہے کہ اس میں حیدر آباد دکن والوں کے ہاں مقامی علامات ظاہر ہونا شروع ہو گئیں۔

علامتوں کا تعین ہر دھرتی کی آب و ہوا، نشست و برخاست، تہذیب و تمدن، رسم و رواج، مذہبی تصورات، سماجی و سیاسی آگہی اور تخلیق کار کی ذاتی دلچسپی سے بھی ہوتا ہے۔ فن کار کی فکری جہات کی وجہ سے کئی علامتیں تشکیل پاتی ہیں۔ اس حوالے سے یہ اقتباس:

> "اردو غزل میں گل و بلبل روایتی عاشق و معشوق کی علامت کے طور پر استعمال کیے گئے ـــــ اس علامت سے قاری کا ذہن اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ اسے کسی طرح سمجھانے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ـــــ اسی طرح متصوفانہ شاعری میں، زاہد، محتسب، کو مکارت اور فریبی، دنیا دار کی علامت بنا دیا گیا۔ برق و نشیمن سے ظالم اور مظلوم کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے۔"(۲)

بعد میں بھی بلکہ اب تک انھیں علامتوں کا سکہ چل رہا ہے۔ مثلاً شراب، مے خانہ، پیالہ اور صراحی کے ذریعے اپنے دور کے حقائق اور ان کے پیش کرنے کے ردِ عمل کے بارے میں اب تک یہ سب کچھ چل رہا ہے۔

اس حوالے سے مقامی اثرات سب سے پہلے نظیر اکبر آبادیؔ کے ہاں نظر آتے ہیں جس کی انھوں نے اپنے ماحول سے آب یاری کی اور یوں اس کے ہاں ہندوستانی فضا نے اردو نظم میں اپنا دیدار کرایا۔ اگرچہ اُس وقت اُس دور میں شہنشاہیت اور بعد میں مغرب سامراج کی مرضی کے خلاف کچھ کہنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا لیکن شعرا اشاروں کنایوں میں ان علامات سے اظہارِ خیال کرتے تھے۔ ساتھ ساتھ صنعتی نظام بھی پوری دنیا میں اپنا اثر دکھا رہا تھا اور مزاحمت کا اثر اپنا زور پکڑ رہا تھا۔

بعد میں اقبالؔ کے ہاں بھی علامتی نظام کی بنیاد رکھی گئی۔ اقبالؔ نے اپنا چراغ اشتراکی نظام سے روشن کیا لیکن بعد میں اسلامی فلسفہ فکر کو اپنی شاعری میں سمویا۔ مسلم امہ کی زبوں حالی نے اقبالؔ کو بہت رنجیدہ کر دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی غلطیوں سے سیکھیں اور ماضی کی طرح ایک بار پھر پوری دنیا پر حکمرانی کریں۔ اقبالؔ کا دور جنگِ آزادی کی جدوجہد کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے اپنی شاعری میں کئی ایک علامات وضع کیں۔ مثلاً "مردِ مومن" ایسی روحانی اصطلاح ہے جسے صرف مسلمان ہی سمجھ سکتا ہے اور اس کو اپنی زندگی میں عملی طور پر برت سکتا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ مسلمان قوم زبوں حالی اور بے حوصلگی کا شکار تھی اور اس طرح انگریز سامراج کے خلاف جدوجہد کے لیے "مردِ مومن" کی اصطلاح بہترین تھی۔

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www.al-aasar.com
Vol. 2, No. 3 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN:3006-6921

اسی طرح اقبالؔ کے حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اقبال نے ان حالات کو مدِ نظر رکھ کر اپنی شاعری میں "شاہین" کی علامت سے قوت عمل، جرأت وہمت، حرکت ونمو اور عزت وخودداری کے حوالے سے اپنے دور، اپنی قوم اور برطانوی سامراج کے خلاف معانی خیز اظہار کیے۔"(۳)

چوں کہ شاعر پردوں کے اندر اپنی علامات کو ہتھیار کے طور پر استعمال میں لاتا ہے اور اس لیے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اقبالؔ رومانوی شاعری سے بھی حد درجہ متاثر تھے اس لیے اُن کے ہاں رومانی عناصر کی کار فرمائی بھی ملتی ہے۔ ان کے ہاں فطرت کے قریبی عناصر کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ مثلاً ان کے ہاں جگنو، کہسار، صبح کا مؤذن، صبح کا ستارہ، ماہ نو اور ہمالیہ کی علامتیں بھی عام ہیں۔ اقبالؔ کے ہاں بلبل، برق، نشیمن اور قفس کے تصورات بھی ملتے ہیں۔ اس طرح جنوں اور اور اہلِ جنوں کے تصور بھی ان کے ہاں اپنا رنگ دکھاتے نظر آتے ہیں لیکن ایک الگ تصور کے طور پر ان کے ہاں بلبل محض عاشق نہیں بلکہ قوم کے ایک فعال مرد کے طور پر اپنی ذمہ داریاں نبھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ ساتھ ساتھ ان کے ہاں استعمال ہونے والی علامتوں میں نشیمن کا تصور شاہین کے رہنے کی جگہ ہے اور اس سے اقبالؔ ایک بہادر اور جفاکش مسلمان کے طور پر اخذ کرتے ہیں۔ اسی طرح آزادی سے مراد آزادی کا نشہ ہے کیوں کہ ایک غلام قوم کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ نہیں دیتی۔ اقبالؔ کے ہاں عشق وعاشقی کی علامات مسلمانوں کے اندر حرکت وعمل کے لیے مستعمل ہوتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ان علامتوں کو مسلمانوں کی کم حوصلگی اور بے چینی سے نکالنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ایک اور جگہ ان کے ہاں "عشق" کا تصور ملتا ہے جو عشق وعاشقی اور معاملاتِ عشق سے بالکل الگ تھلگ اور عشقِ حقیقی کے معنی میں استعمال میں لائی جاسکتی ہے۔ اس سے اقبالؔ کی شاعری میں حرکت وعمل کا احساس ہوتا ہے اور وہ مسلمانوں کے اندر بیداری کے جذبات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس حوالے سے اقبالؔ کے بارے میں یہ اقتباس قابلِ توجہ ہے:

> "اردو شاعری کی کلاسیکی علامتوں کے مفاہیم میں تبدیلی مثلاً بلبل، قفس، برق اور نشیمن کا تصور اقبال کے یہاں کلاسیکی شاعری سے مختلف ہے۔ اسی طرح جنوں اور اہلِ جنوں کا تصور، مے خانہ کا تصور اقبال سے ہوتا ہوا ترقی پسندوں کے یہاں پہنچ کر بالکل تبدیل ہو جاتا ہے بلبل، محض عاشق نہیں بلکہ قوم کا کہیں ایک فرد اور کہیں غلام انسان کی علامت بن جاتا ہے۔ اس طرح مے آزادی اور مے خانہ آزاد زندگی یا آزاد ملک کے تصور سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ یہ علامتیں وہ ہیں جو عام طور پر اردو شاعری کا جزو رہیں اور انفرادی علامتوں سے مختلف ہیں۔"(۴)

اردو شاعری کی جدید روایت پر نظر ڈالنے سے ہماری نگاہ ایک اہم شاعر میراجی پر پڑتی ہے۔ ان کے ہاں مغربی سمبل ازم کی علامت بھی موجود ہیں۔ انھوں نے ان علامات کو نئے نئے معنی پہنا دیئے۔ ان کے ہاں جنسی علامات کی دل کش مثالیں ملتی ہیں۔ انھوں نے ان علامات کو جدید استعارے پہنا دیئے۔ ان علامات میں میراجی کی انفرادیت نظر آتی ہے۔

میراجی کے بعد ترقی پسند شعرا کے ہاں بھی نئی نئی علامات وضع ہوئیں۔ ان علامات کی جدید اشکال متعارف ہوئیں۔ جیسے "سرخ سویرا"، "سرخی" جیسی علامات انقلاب کے لیے استعمال ہوئیں۔ اسی طرح ان کے ہاں "تاریکی"، "سیاہی"، "تیرگی" کو غیر جمہوری علامتوں کے حوالے سے استعمال کیا گیا۔ ان علامات سے اردو شاعری نے نئے معنی پہن لیے۔ اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "جدید شاعروں کئے یہاں علامتوں کے نئے انداز و مفہوم ملتے ہیں۔ پگڈنڈی، پیڑ، مرد اور عورت کے لیے استعمال کیا گیا۔ اسی طرح ندی نسوانی علامت کے طور پر اور اس کے آس پاس کھڑا ہوا پیڑ مرد کی علامت کے لیے۔ اس دور کے شاعروں کے یہاں سورج، شام، شہر، رات اور صبح کی علامتوں کو نئے انداز میں پیش کیا گیا۔"(۵)

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www.al-aasar.com
Vol. 2, No. 3 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN:3006-6921

ترقی پسندوں کے بعد جدید شاعروں نے سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کے زیرِ اثر اپنے دور کی عکاسی کرتی ہوئی علامات کو استعمال کیا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہو جاتا ہے کہ علامت بذاتِ خود کوئی منجمد خیال یا شے نہیں ہے بلکہ کسی خیال کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ نمائندگی تین قسم کے فکری رویوں کی تکمیل کرتی ہے۔ پہلا فکری زاویہ آگہی ہے۔ کیوں کہ آگہی سے ہی علامات کی تشریح و تعبیر ممکن ہے۔ دوسرا خودارادیت ہے۔ خود ارادیت سے مراد یہ ہے کہ علامت سے خود کیسے باخبری کا احساس ہو۔ تیسرا فکری پہلو عمل ہے۔ کیوں کہ عمل سے ہی علامت کا وجدان ہو سکتا ہے اور فن کار اس پر عمل پیرا ہو کر ہی اصل علامت سے ناظرین و قارئین کو باخبر کرا سکتا ہے۔ اس حوالے سے یہ اقتباس قابلِ ذکر ہے:

> "آگہی! شاعر یا ادیب کسی شے (جان دار یا بے جان) کی خارجی یا داخلی خصوصیت، رنگ و روپ، جبلت، عادت اور اس کے صفات کا جب سچا علم رکھتا ہے تو وہ اس شے کی جبلت یا صفات کو کسی دوسری شے کی نمائندگی کے لیے علامت بناتا ہے تو یہی اس کی آگہی کہی جائے گی۔

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی
جیتے کا جگر چاہیئے شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنی و دانش و فرہنگ (۶)

اس طرح ان علامات سے اقبالؔ کی شاعرانہ اپج صاف ظاہر ہوتی ہے۔ اقبالؔ کے ہاں علاماتی نظام کی ایسی جہتیں متعارف ہوئی ہیں کہ انسان ورطہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ اقبالؔ نے شاہین کی علامت کہیں تو جفاکشی اور محنت کشی کے لیے استعمال کی ہے تو کہیں مطلق العنان حاکم بن کر رہنے والے کی۔ اسی طرح شاہین کی ہی علامت سے انھوں نے اچھے انسان پر برے آدمی کے اثرات تو کہیں اپنی محنت و کاوش سے سب کچھ حاصل کرنے والے کی۔ شاہین کی صفت اور جبلت کے عمل نے اس کے معنی کی کئی ایک تعبیریں متعین کی ہیں۔ گویا علامتی انداز سے شاعر معنوی طور پر زیادہ بہتر انداز میں ابلاغ کر سکتا ہے اور اپنے معنوی کلام کی زیادہ بہت انداز میں تشریح کر سکتا ہے۔ بعد میں یہی کچھ اقبالؔ کی علامات سے ظاہر ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر سرور احمد، اردو اور ہندی رومانوی شاعری میں علامتوں کا مطالعہ، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۶
۲۔ ایضاً، ص ۴۹۔۵۰
۳۔ ایضاً، ص ۵۱
۴۔ ایضاً
۵۔ ایضاً، ص ۵۲
۶۔ ایضاً، ص ۵۶۔۵۷